

الفاظ کی حرمت

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

کوئی تین ماہ قبل میں نے اپنے کالم میں یہ شعر لکھا تھا۔

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں کیجا کیا
ورنہ تو میرا نہیں تھا اور میں تیرا نہ تھا

اس کالم کے علاوہ بھی میں نے یہ بات کئی بار لکھی کہ مسلم لیگ (ن) اور پی پی پی کا ”اصولی اتحاد“ پرویز مشرف کے جرنیلی وجود کا مرہون منت ہے۔ جو نجی جنرل صاحب کے اقتدار کا سورج غروب ہوگا، ان بڑی جماعتوں کے درمیان اختلافات کا سورج طلوع ہو جائے گا اور اقتدار کی سیاست اصولی اتحاد کو بے اصول بنا کر رکھ دے گی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس اتحاد کو اتنی جلدی ٹوٹنے نہیں دیکھ رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ میاں صاحب اور زرداری صاحب ”بھائی“ کے لفظ کا بھرم رکھیں گے اور برادران یوسف بننے میں کچھ وقت لیں گے لیکن اب تو مستقبل کی سیاست کا تصور کرتا ہوں تو اپنے مرحوم دوست آغا شورش کشمیری کا ایک پسندیدہ شعر یادوں کے جھروکے سے نکل کر قلم کی نوک پر آ جاتا ہے۔

میرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

تماش بین یوں کہ ابھی تک مسلم لیگ (ق) قاتل لیگ تھی، نفرت کی علامت تھی، نیپ اور بے ضمیری کی پیداوار تھی، ایک آمر کی لونڈی، جرنیلوں کی میسجنگی اور آمریت کے تسلط کا سبب سمجھی جاتی تھی لیکن اب جو سیاست نے پلٹا دکھایا ہے تو دونوں بڑی جماعتیں مسلم لیگ (ق) سے 5 سال لوٹ کھسوٹ کا حساب اور اس کا سیاسی حاسبہ کرنے کی بجائے اسے اپنے اپنے حرم میں داخل کرنے کے لئے بے چین ہیں، جنرل پرویز مشرف کے ستون چوہدری برادران کی ناز برداری کی جارہی ہے، سیاسی گٹھ جوڑ اور وعدے وعید کا سلسلہ جاری ہے۔ موٹی سی بات ہے کہ مسلم لیگ (ق) اب چوہدری برادران کی پارٹی ہے اور چوہدری برادران اور بھٹو خاندان کے درمیان چوہدری ظہور الہی کے خون کی لکیر حاکم ہے، اس لئے وہ ”کوئی غیرت“ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پی پی پی کی جانب جانے سے گریزاں ہوں گے۔ جنرل پرویز بھی یہی خواہش رکھتے تھے اور اسی آرزو کو سینے میں دبائے دبا کر ایوان صدر سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے جب پی پی پی سے سمجھوتہ کیا تھا تو ان کے ذہن میں بھی یہی روڈ میپ تھا کہ مسلم لیگ (ق) اور پی پی پی اقتدار میں پارٹنر بنادی جائیں گی چنانچہ چوہدری یوں کی مخالفت کے پیش نظر انہوں نے چوہدری برادران کو پارٹی قیادت سے ہٹانے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا لیکن اللہ کو کچھ اور سی منظور تھا۔ چوہدری برادران مسلم لیگ کو اپنی سیاسی وراثت سمجھتے ہیں۔ ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ سے لے کر مسلم لیگ جو نیچو، مسلم لیگ نواز سے ہوتے ہوئے مسلم لیگ (ق) تک کا سیاسی سفر ان کے سیاسی ورثے کا اہم حصہ ہے، اس لئے اب بھی اگر وہ دونوں بڑی جماعتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں تو مسلم لیگ (ن) ان کی قدرتی حلیف ہوگی کیونکہ

گو وہاں نہیں، وہاں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو نہت ہے دُور کی

اس لمحے کے انتظار میں چوہدری برادران نے چار چھ ماہ گزار دیئے۔ انہیں یقین تھا تھا کہ جب پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) کا اتحاد جینی حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہوگا تو اصل میں یہ ان کی فتح ہوگی اور ہمیں سے ان کا نیا سیاسی سفر شروع ہوگا۔ یہ بات وہ فارورڈ بلاک اور دوسرے باغی ساتھیوں کو بھی سمجھاتے تھے لیکن باغی طویل انتظار کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ اب یوں لگتا ہے کہ اصولی سیاست ایک بار پھر سیاسی وعدوں کی مانند ہوا میں بکھر جائے گی، جوڑ توڑ، بارس ٹریڈنگ اور وفاداریاں بدلنے کی رسم نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔ پی پی پی کی نوکمر کا قلعہ سنبھالنے اور مسلم لیگ (ن) کو پنجاب پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے تک و دو کرنی پڑے گی اور اس جدوجہد میں شاید چھانگہ مانگا کی یادیں ایک بار پھر تازہ ہو جائیں جنہیں دفن کرنے کی خوشخبری چند ماہ قبل زرداری صاحب نے سنائی تھی۔ اس سارے منظر نامے میں وہ قومی مجرم جنرل پرویز مشرف، جس کے خلاف ہم آٹھ برس تک لکھتے رہے، سیاسی ولی بن کر ابھرے گا کیونکہ اس نے چند روز قبل ہی کہا تھا کہ زرداری اور نووازشریف ایک دوسرے سے لڑیں گے، زرداری کبھی تجوں کو بحال نہیں کرے گا۔ ایک بار پھر لوٹ مار کا کلچر جنم لے گا وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ اس قومی مجرم کو سیاسی ولی کون بنا رہا ہے؟ ہمارے وہی مقبول اور ہر لحاظ پر سیاستدان جن سے ہم امیدوں کا گلستان بنائے اور سجائے بیٹھے تھے۔ میرے بشمول پاکستان کے عوام کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ تھی کہ دونوں بڑی جماعتوں کا اتحاد قائم ہے، وہ ہمیں جمہوریت کی راہ پر آگے بڑھائیں، آمریت کو ابدی نیند سلائیں اور قومی مسائل حل کریں اور اس حوالے سے آج سب سے زیادہ ادا اس، پریشان اور دل گرفتہ کون ہیں؟ میرے بشمول پاکستان کے عوام جنہوں نے ایک نئی صبح کی آس میں اٹھارہ فروری کو ووٹ دیئے تھے اور دونوں بڑی پارٹیوں کے اتحاد پر خوشی کے چراغ جلائے تھے۔ اب سیاستدانوں کو سمجھ جانا چاہئے کہ جب ملک میں فوجی آمر آتا ہے یا جب اسمبلیاں ٹوٹی ہیں تو لوگ مٹھائیاں کیوں بانٹتے ہیں؟؟

یہ بھی اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس اتحاد کو توڑنے میں ”آخری مکا“ جناب زرداری صاحب کا یہ بیان تھا کہ سیاسی معاہدے قرآن وحدیث نہیں ہوتے۔ یہ بیان پڑھ کر مجھے شدید دھچکا لگا اور مجھے اپنے ایک بزرگ یاد آگئے جو کہا کرتے تھے کہ ”وعدے سوچ سمجھ کر کرو اور پھر ہمیشہ اپنے الفاظ کا پھرہ دو کیونکہ یہ زمین اور آسمان فقط ایک لفظ پر کھڑے ہیں۔ جو لوگ الفاظ کی حرمت پامال کرتے ہیں، وقت انہیں پامال کر دیتا ہے“ میں نے زرداری صاحب کا یہ بیان پڑھا تو مجھے چاہا کہ ان سے کہوں کہ حضور والا! قرآن وحدیث تو وعدوں اور معاہدوں کی پابندی کرنے کے احکامات سے بھرے پڑے ہیں اور جو لوگ

اپنے وعدوں کا وقار نہیں بچاتے، وہ خود بے وقار ہو جاتے ہیں۔ اسوۂ حسنہ، سیرت نبویؐ جو ہمارے لئے بہترین رول ماڈل اور رہنمائی کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے، وعدوں اور معاہدوں کو پورا کرنے کے واقعات سے بھری پڑی ہے، چاہے ان وعدوں کو پورا کرنے کے لئے کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑی اور قربانیاں دیں پڑیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے قائد..... قائد اعظمؒ کیوں بنے اور کیوں قائد اعظمؒ کہلائے؟ اس لئے کہ ان کا کردار بے داغ تھا، ان کے دامن پر جھوٹ اور سرکہ فریب کے داغ نہیں تھے اور وہ نہرو کی مانند اپنے الفاظ بدلنے نہیں تھے۔ تفصیل میں کیا جاؤں۔ مسئلہ کشمیر کیا ہے؟ فقط وعدوں سے انحراف کی کہانی ہے۔ نہرو نے اقوام متحدہ سے کشمیر میں استصواب رائے کرانے کا وعدہ کیا اور بعد ازاں زمینی حقائق کا بہانہ بنا کر اپنے وعدے سے ٹکر گیا۔ چنانچہ وعدہ فراموشی اور بدعتی نے مسئلہ لٹکا دیا۔ لیڈر تو قوم کا رہنما اور نمائندہ ہوتا ہے اور نو جوانوں کے لئے رول ماڈل ہوتا ہے۔ کیا وعدوں سے انحراف کرنے والا شخص قوم کا لیڈر اور نو جوانوں کا رول ماڈل ہو سکتا ہے؟ اور پھر جو شخص لیڈری کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنے الفاظ پر قائم نہ رہے، کیا قوم اس پر اعتماد اور اعتبار کر سکتی ہے؟ قوم اور لیڈروں کے درمیان ایک سوشل کنٹریکٹ یا سمجھوتہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے منشور پر عمل کریں گے۔ اسی سمجھوتے کے تحت عوام ووٹ دیتے اور لیڈر حکمرانی کرتے ہیں۔ جو شخص اپنے معاہدوں کا پابند نہ ہو، کیا قوم اس سے کوئی معاہدہ کر سکتی ہے؟ ہم مغربی ممالک کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن مغربی جمہوری ممالک کا کوئی سیاستدان یا لیڈر جھوٹ بولنا یا اپنے معاہدے سے منحرف ہونا ”افورڈ“ نہیں کر سکتا۔ کسی اسٹیج پر بھی کسی لیڈر کے جھوٹ یا وعدہ فراموشی کا راز فاش ہو تو قوم اسے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہی ایک نمایاں فرق ہوتا ہے جمہوریت اور آمریت میں کہ آمر جھوٹ جھوٹ بول کر بھی، وعدہ فراموشی کر کے بھی اقتدار سے چٹا رہتا ہے لیکن جمہوریت میں ایسا ممکن نہیں۔ زرداری صاحب کو صدارت کی امیدواری مبارک۔ بے حد مبارک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا معاہدوں کو پامال کرنے والا شخص اقتدار کی امانت کا اہل ہو سکتا ہے؟ کیا وہ عوام کی نظروں میں احترام کما سکتا ہے؟ اور قوم کی رہنمائی کا حق ادا کر سکتا ہے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns, Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

Menzel Abhi Nahi Aye

August 20th, 2008

[African Domain Names](#)

Complete Africa Domain Registration No
Setup Fees - Free DNS Hosting

[Eid Mubarak Eid Mubarak](#)

Authentic Islamic Books Available. Delivery
Anywhere In The World.

منزل ابھی نہیں آئی

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

میں نے ٹی وی لگا یا تو صدر بلکہ سابق صدر جنرل پرویز مشرف نہایت جاق و چو بند اور متاثر کن (Impressive) گارڈ آف آنر لے رہے تھے۔ اس سے قبل فوج، ایئر فورس اور نیوی کے سربراہان ان سے مل چکے تھے اور ان پر اپنے اپنے جذبات کے پھول نچا کر رکھ چکے تھے۔ پھر وہ اپنے اسٹاف سے ملے اور ٹیلی کا پیئر پر بیٹھ کر شاید آری ہاؤس کے لئے اڑ گئے جہاں انہوں نے ابھی مزید کچھ عرصہ قیام کرتا ہے۔ میں یہ متاثر کرنے والا منظر دیکھتے دیکھتے تاریخ کی وادی میں کھو گیا اور میری چشم تصور میں پاکستان کے منتخب اور درویش منش صدر رفیق تارڑ کی ایوان صدر سے رخصتی کا منظر گھومنے لگا۔ جب جنرل پرویز مشرف نے صدارت پر قبضے کا فیصلہ کیا تو قوم کے منتخب وزیراعظم کو قید کرنے کے بعد منتخب صدر کو کچھ اس طرح بے توقیری سے رخصت کیا کہ وہ کارکی ڈیگی میں چند سوٹ کیس رکھ کر بذر ایئر روڈ لاہور تشریف لے آئے اور اپنے گھر میں ڈیوڈال کر اللہ اللہ کرنے لگے۔ ان کا قصور کیا تھا؟ ان کا قصور یہ تھا کہ انہیں عوام کی منتخب پارلیمنٹ نے آئین کے مطابق پانچ سال کے لئے منتخب کیا تھا۔

جنرل پرویز مشرف کو اس تزک احتشام اور عزت و وقار کے ساتھ کیوں رخصت کیا گیا؟ اس لئے کہ وہ سابق آرمی چیف تھے حالانکہ انہوں نے ایک جمہوری حکومت پر شب خون مارا تھا، اپنے عہدے کے حلف سے بے وفائی کی تھی اور ملک کے آئین کو توڑا تھا۔ ان کے سارے جرائم معاف کر کے انہیں سربراہ مملکت کے برابر پروٹوکول دیا گیا کیونکہ وہ ان کے ”چینی بھرا“ تھے جبکہ ”طاقتور“ پاکستان کے عوام اور ان کے منتخب کردہ جمہوری نمائندوں کو کیا اہمیت دیتے ہیں، اس کا اندازہ جناب جسٹس رفیق تارڑ کی بے وقار رخصتی سے ہوتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اپنے آپ سے سوال کرنے لگا کہ کوئی عوام کی بالادستی؟ کوئی جمہوریت اور آئین کی حکمرانی؟ ابھی ہمیں جمہوریت کی بالادستی اور عوام کی حکمرانی کے لئے طویل سفر طے کرنا ہے اور اس سفر میں عوام کی کامیابی کا انحصار ان کی قیادت کی اہلیت پر ہے۔

کیا ہمیں اس قدر اہل قیادت میسر ہے جو پاکستان کو اپنی منزل پر پہنچا سکے، ملک میں آئین اور عوام کی صحیح معنوں میں حکمران کا خواب شرمندہ تعبیر کر سکے اور نظریہ ضرورت کو ہمیشہ کے لئے ذہن کر سکے؟ ملک میں آئین اور عوام کی صحیح معنوں میں حکمرانی کا خواب شرمندہ تعبیر کر سکے اور نظریہ ضرورت کو ہمیشہ کے لئے ذہن کر سکے؟ میں یہ سوچتے ہوئے اور اس سوال کا جواب تلاش کرتے کرتے لڑکھڑانے لگا۔ صرف جمہوری عمل سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جمہوری عمل کا آغاز تو 1988ء میں بھی ہوا تھا اور چار عام انتخابات ہونے کے بعد دنیا بھر کے ریسرچ کارلرز اور تھنک ٹینک پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل کو روشن قرار دیتے ہوئے اسے عالمی جمہوری لہر (wave) کا مستقل حصہ قرار دینے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پاکستان میں آمریت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذہن ہو چکی ہے اور فوج مستقل طور پر پیرکوں میں جا چکی ہے لیکن اچانک 12 اکتوبر 1999ء کی شام عساکر پاکستان نے اسلام آباد میں پاکستان ٹیلی ویژن کی دیواروں کو پھلانگ کر بلڈنگ پر قبضہ کر لیا اور پروگرام بند کر دیئے تو راز کھلا کہ جس جن کو ہم نے بزدل کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، وہ بھل سے نکل آیا ہے۔ بلاشبہ یہ صرف جرنیلوں کی ہوس اقتدار نہیں تھی بلکہ اس میں خاصی حد تک ہماری سیاسی قیادت کا بھی قصور تھا جس نے جرنیلوں کو یہ موقع فراہم کیا تھا۔ وہ گھات لگائے بیٹھے تھے اگر ہماری قیادت سمجھداری، بصیرت اور قائدانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیتی تو شاید گھات لگانے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکتے لیکن ایک بات تلے تھی کہ ابھی تک ہمارے جرنیلوں کے دلوں اور ذہنوں سے خوئے سلطانی اور بوئے سلطانی نہیں گئی تھی۔

ابھی تک انہوں نے ذہنوں سے عوامی حکومت اور جمہوری اداروں کی بالادستی کو قبول نہیں کیا تھا۔ ابھی تک وہ عوامی جذبات کے مقابلے میں اپنے ”چینی بھراؤں“ اور سابق ”پاسوں“ کے وقار کو ترجیح دیتے ہیں۔ خیال کی اسی گلی میں ٹپٹے ٹپٹے مجھے یاد آیا کہ جس جنرل یحییٰ خان نے ملک توڑا اور قومی استحکام کو شراب کے پیالے میں ڈبو کر اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ہم نے ”قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے اور صدیوں کی مسلمان غلامی کا بدلہ لے لیا ہے فوج نے اس یحییٰ خان..... قومی بھرم..... کو پورے تزک احتشام اور پروٹوکول سے دفن کیا، تو پھر رکھ کر اس کے جسم خاکی کو قبرستان لایا گیا، فوجی دستوں نے اس کی نعش کو سلامی دی اور پھر اس پاکستان کے جھنڈے میں اس کے جسم کو پھینکا گیا جس پاکستان کے یحییٰ خان نے نکلے نکلے کر دیئے تھے اور جس پاکستان کے وجود کی ہماری فوج محافظ اعلیٰ کہلاتی تھی۔ کل جب لوگ سڑکوں پر نعرے لگا رہے تھے کہ ”مشرف کا جو یار ہے، غدار ہے غدار ہے“ اور ”اکبر بگٹی اور لالہ صاحبہ کے معصوموں کے قاتل کو پھانسی دو“ اور ”ایمر جنسی لگا کر عدلیہ کو نکالنے والے کا محاسبہ کرو“ تو نہ جانے کیوں مجھے یحییٰ خان کے توپ بردار جنارے کے مناظر کیوں بار بار یاد آ رہے تھے اور نہ جانے کیوں جنرل پرویز مشرف کی ایوان صدر سے پر شکوہ رخصتی اور متاثر کن گارڈ آف آنر کی تصویر کیوں..... کیوں..... بار بار میری نگاہوں کے سامنے آ کر رک جاتی تھی اور نہ جانے کیوں ہوا کا جھونکا کیوں بار بار میرے کانوں میں یہی سرگوشی کرتا تھا۔

چلے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی

اور پھر میں اپنے آپ سے یہ پوچھنے لگتا تھا کہ کیا ہم منزل پر پہنچ جائیں گے؟

Print This Post | Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »

Gulam Mulk Ke Yateem...

August 18th, 2008

غلام ملک کے یتیم بچے؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا خیال آتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے ہم ایک غلام قوم کے یتیم بچے ہیں جن کے سروں پر ریاست کا ہاتھ ہے اور نہ ہی حکومت کا سایہ۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اتنے بے بس اور اتنے بے توقیر ہو چکے ہیں کہ تنکوں کی مانند گلیوں بازاروں میں اڑتے پھرتے ہیں اور کوئی ہماری حالت زار پر رحم کھانے کو تیار نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور اس کے بچوں کا خیال آتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور جسم خالموں کے خلاف نفرت سے جلتے لگتا ہے۔ مگر ام جیل کے درو دیوار سے نکراتی ہوئی عافیہ کی جینیں، آدھو پکا اور اللہ کے حضور فریادیں مجھے دکھ، درد اور اداسی کی ان وادیوں میں اتار دیتی ہیں جن کا کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں۔ مان لیا کہ پسماندہ ملک کی آزادی کوئی آزادی نہیں ہوتی لیکن یار سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم کبھی بھی اتنے بے توقیر، بے وقار اور قابلِ رحم نہیں تھے جتنے ہمیں گزشتہ سات برسوں میں بنا دیا گیا ہے۔ مانا کہ ہم کوئی سپر پاور یا بڑی عالمی طاقت نہیں تھے لیکن پھر بھی عالمی سطح پر ہمارا ایک وقار تھا، عزت تھی اور حیثیت تھی جو نائن الیون کے بعد ہمارے فوجی سربراہ کے ہاتھوں خاک میں مل چکی ہے۔ امریکہ کی بے پناہ وفاداری اور خوشامد کے سبب ہماری حیثیت ان غلاموں سے بھی بدتر ہو چکی ہے جن کی امریکی گوروں کے خلاف جدوجہد تاریخ کا عبرت ناک باب ہے اور نسلی تقاضا کا منہ بولتا ہوا شرمناک ثبوت ہے۔ کیا ہم نے یہ آزادی اسی لئے حاصل کی تھی کہ امریکی غلامی کی ذلت و خوارگی میں اس طرح جکڑے جائیں کہ ہم خود اپنے شہریوں کو پکڑ پکڑ کر شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے حوالے کرنا شروع کر دیں؟ اپنی بیٹیوں کو ڈالروں کے عوض فروخت کرنا شروع کر دیں اور اپنے ملک کے شہریوں کو ریاستی چھت اور تحفظ سے محروم کر دیں تاکہ ان میں ملک سے محبت اور تقاضا کا جذبہ پیدا ہونے کی بجائے ندامت کے جذبات ابھرنے لگیں؟ خدا جانے دختر فروشی بڑا گناہ ہے یا دختر کشی؟ لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے دختر کشی تو تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکی جبکہ دختر فروشی ایسا گناہ ہے کہ جس کا حکمرانوں کو دونوں جہانوں میں حساب دینا ہوگا اور اپنے اعمال کے جہنم میں جلنا ہوگا۔ لیکن رکھیے اس طرح کے گناہوں کی سزا اس جہان میں بھی ملتی ہے اور لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عبرت کے سامان دکھاتے رہتے ہیں لیکن انسان ہی سنگدل ہے جو عبرت حاصل نہیں کرتا۔

ڈاکٹر عافیہ کی جینیں مجھے ہر لمحہ بے چین رکھتی ہیں اور میں اس کے لئے ہمہ وقت دعائیں مانگتا اور اللہ کے حضور آرزو کرتا ہوں اور کبھی کبھی یہ سوچ کر ندامت سے کھٹکتے لگتا ہوں کہ ہم صدیوں سے اپنے بچوں کو یہ پڑھا رہے ہیں کہ مسلمان فوج کا ایک جرنیل محمد بن قاسم ایک مسلمان خاتون کی چیخ و پکار اور غلیظہ سے فریاد کی آواز سن کر سندھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا ہم ان روایات کے امین ہیں لیکن اب ہمارے جرنیلی حکمرانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خود قوم کی بیٹیوں کو غیروں کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہیں اور ہمارے سیاسی حکمرانوں کا یہ عالم ہے وہ اس پر احتجاج کرنے کی بجائے بغلیں جھانک رہے ہیں۔ نہ وزیر اعظم کو یہ توفیق ہوئی ہے کہ وہ امریکی حکومت سے عافیہ اور اس کے بچوں کی رہائی کی اپیل کریں اور نہ ہی ہمارے بڑے بڑے قائدین زرداری صاحب اور میاں صاحب کو ہمت ہوئی ہے کہ وہ امریکی سفیر سے عافیہ کے ساتھ روادار کھنے جانے والے سلوک پر احتجاج کریں۔ وہی امریکی سفیر جو ان سے تواتر ملتی رہتی ہیں اور اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے لالچ کرتی رہتی ہیں۔ دراصل ابھی تک ہماری حکومت اس مسئلے سے الگ تھلک کھڑی ہے، کیونکہ اس میں کوئی دھم ہی نہیں بلکہ اس بیچاری میں نہ دم ہے نہ خم ہے۔ اس صورتحال میں شہریوں میں اس احساس کا جنم لینا قدرتی بات ہے کہ ہم غلام ملک کے یتیم بچے ہیں اور ہمارے سروں پر آسماں موجود نہیں ہے۔

میں نے چار دہائیاں قبل ڈپلومیسی کی ایک کتاب میں ڈپلومیٹ کی تعریف کچھ یوں پڑھی تھی کہ ڈپلومیٹ (سفارت کار) وہ شخص ہوتا ہے جسے ایمانداری سے جھوٹ بولنے کے لئے بیرون وطن بھیجا جاتا ہے۔ اصل الفاظ کچھ یوں تھے۔ Diplomat is a person, sent abroad to tell lie۔ 16 اگست کے دن میں امریکی سفیر محترمہ مین ڈبلیو پیٹرین کا مراسلہ پڑھ کر مجھے یہ بھولا بسر افتقرہ بہت یاد آ گیا۔ امریکی سفیر یا وائسرائے پاکستان کا فرمان ہے کہ "17 جولائی 2008ء سے پہلے ڈاکٹر عافیہ صدیقی مگر ام انیر بیس یا افغانستان میں بالکل امریکی حراست میں نہیں تھی اور نہ ہی امریکہ کو اس کے بارے میں علم تھا۔ اس پر الزام ہے امریکی عہدے دار پر فائرنگ کا جو اس نے تقشیش کے دوران رائفل چھین کر کی۔ عافیہ سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے عوض ڈالر ادا کئے گئے ہیں۔ امریکی حکومت کو اس کے بچوں کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔"

اصل صورتحال تو اسی وقت سامنے آئے گی جب عافیہ خود ظلم کی داستان سے پردہ اٹھائے گی لیکن اگر اب تک سامنے آنے والے حقائق کے تانے بانے کو جوڑا جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ القاعدہ سے تعلقات کے حوالے سے امریکہ کو مطلوب تھی۔ 2003ء میں اسے کچھ نقاب پوشوں نے بعد تین بچوں کے اغوا کر لیا جس کے بعد وہ لا پتہ ہو گئی۔ اس کے غائب کئے جانے کے دوسرے تیسرے دن ایک سائیکل سوار ڈاکٹر عافیہ کے والدین کے گھر آیا اور دمکلی دی کہ اگر اپنی بیٹی کی زندگی چاہتے ہو تو خاموش رہو۔ پاکستان سے ڈاکٹر عافیہ کو یوں کون غائب کر سکتا تھا اور کون اسے افغانستان پہنچا سکتا تھا، جہاں اس نے چار سال گزار دیئے؟ ظاہر ہے کہ یہ کارنامہ صرف آئی ایس آئی سرانجام دینے کی اہل ہے اور صرف آئی ایس آئی ہی پاکستانیوں کو پکڑ کر ایف بی آئی یا امریکہ کے حوالے کرتی رہی ہے۔ طالبان کے سابق سفیر ملا حنیف کا کہنا تھا کہ جب اسے گرفتار کر کے امریکہ کے حوالہ کیا گیا تو آئی ایس آئی

کے کارندوں نے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے اتنا مارا کہ جسم لہو لہان کر دیا۔ اسے امریکی تشدد سے شکایت نہیں تھی اسے گلہ اپنوں سے تھا۔ اس کیس میں ڈاکٹر عافیہ افغانستان کو مطلوب نہیں تھیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اسے ہمارے دختر فروشوں نے پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا جو اسے افغانستان لے گئے اور یہ راز اس وقت کھلا جب ایک صحافی نے قیدی نمبر 650 کی دلدوز چیخوں اور آدو بکا کا ذکر کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری حکومتی مشینری کو اس کا علم نہ ہو، لیکن نہایت ڈھٹائی سے وزارت داخلہ و خارجہ نے لاطینی کا اظہار کر دیا۔ امریکی سفیر کا یہ بیان کہ 17 جولائی سے قبل ڈاکٹر عافیہ امریکی حراست میں نہیں تھی ناقابل یقین ہے کیونکہ وہ کس طرح اور کیسے افغانستان پہنچی، چار پانچ برس افغانستان میں کیوں قید رہی اور اس پر کیوں تشدد کیا جا تا رہا اور پھر امریکی حکام نے اس سے کیوں تفتیش کی؟ رہی یہ بات کہ عافیہ نے امریکی فوجی سے رائفل چھین کر فائرنگ کی ایک ایسا الزام ہے جس کے کوئی پاؤں نہیں۔ دوسری طرف سی آئی اے کے حوالے سے امریکی اخبارات میں یہ خبر ”لیک“ کی گئی ہے کہ ڈاکٹر عافیہ القاعدہ کو فنڈ فراہم کرنے میں ملوث تھی اور اس گروپ کا حصہ تھی جو ساؤتھ افریقہ سے ہیرے جواہرات خرید کر لاتے تھے اور امریکہ میں فروخت کر کے ڈالرز القاعدہ کو دیتے تھے۔ ڈاکٹر عافیہ کے سابق خاوند کا کہنا ہے کہ اس کے پاس ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ اس عرصے میں وہ کبھی ساؤتھ افریقہ نہیں گئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ڈاکٹر عافیہ کیوں امریکہ کو مطلوب تھی، اسے کیوں کراچی سے اغواء کر کے افغانستان پہنچایا گیا اور جب شور مچا تو اسے فوری طور پر نیویارک عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اسی طرح جب ڈاکٹر عافیہ کے القاعدہ کے ساتھ لنکشن کا ثبوت نہ ملا تو اسے فائرنگ کے مقدمے میں دھریا گیا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ بدست ہاتھی کی مانند انسانی حقوق اور انصاف کو اپنے بھاری پاؤں تلے چل رہا ہے اور سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو انتقام کی آگ میں جلا رہا ہے۔ اس لئے ہمیں امریکہ سے شکایت نہیں، ہمیں شکایت ہے تو ان حکمرانوں اور بھائیوں سے جو پاکستانیوں کو ڈالروں کے عوض بیچ رہے ہیں اور دختر فروشوں میں ملوث رہے ہیں۔ اپنوں کے ان کارناموں کو دیکھ کر ہی مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک غلام ملک کے یتیم بچے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم کبھی بھی اتنے بے وقور، بے وقار اور ہلکے نہیں تھے جتنے آج ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید ہم غربت، مہنگائی اور لوڈ شیدنگ جیسے مسائل کا تو علاج ڈھونڈ لیں لیکن کیا ہم اپنی کھوئی ہوئی قومی عزت، قومی وقار اور حیثیت بھی بحال کر سکیں گے؟



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »

Seder Saab Ka Intehaan?

August 16th, 2008

صدر صاحب کا امتحان؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

چند برس قبل جب ہمارے ”ہر دلعزیز“ صدر صاحب نے ”سب سے پہلے پاکستان“ کا نعرہ لگایا تھا تو میں نے اپنے کالم میں لکھا تھا کہ دراصل یہ نعرہ ”سب سے پہلے کرسی“ ہے، باقی سب شعبہ بازی ہے کیونکہ قائد اعظمؒ اور ان کے چند مخلص ساتھیوں کے بعد جتنے سیاستدان بھی حکمران بنے انہوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ ان کا مانو (Motto) سب سے پہلے کرسی ہے نہ کہ سب سے پہلے پاکستان..... میرے اس تبصرے پر صدر صاحب کے حواریوں نے ناراضگی کا اظہار کیا البتہ یہ الگ بات ہے کہ کابل علی آغا سمیت صدر صاحب کے وہ حواری آج کل میڈیا سے غائب ہیں۔ دور کی بات کیا کریں کیونکہ آپ ماضی کی داستانوں کو سن کر تنگ آچکے ہیں۔ مجھے صرف یہ بتانے کہ اگر صدر صاحب واقعی ہی اپنے نعرے میں مخلص ہوتے تو وہ تین نومبر 2007ء کو ملک میں مارشل لا لگا کر پاکستان کی پولیس بلا دیتے۔ ایمر جنسی لگانے اور بی بی او جاری کرنے کا مقصد فقط اپنی کرسی بچانا تھا کیونکہ افتخار چودھری اور ان کے ساتھی صدر صاحب کی کرسی کے لئے آئینی خطرہ بن چکے تھے۔ اسی طرح اگر انہیں پاکستان واقعی ہی دل و جان سے عزیز ہوتا تو کیا وہ این آر او جاری کر کے ملک کے لوٹے گئے تین پینتیس کھرب روپے حلال کر دیتے۔ میں این آر او کو ملکی خزانے پر سب سے بڑا ڈاکہ سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ صدر صاحب نے یہ سودے بازی کیوں کی۔ صرف اور صرف اپنی صدارت بچنے کے لئے۔ ویسے تو انہیں اگر ملکی خزانے اور قومی امانت کا ذرا بھر بھی خیال ہوتا تو وہ اپنے بے پناہ بے مقصد غیر ملکی دوروں پر اربوں روپے برباد نہ کرتے اور نہ ہی ملکی خزانے سے سپریم کورٹ میں اپنے خلاف مقدمے کے دفاع پر دو ارب اڑتیس (2.38) روپے کی فیسیں پرائیویٹ وکلاء کو ادا کرتے جبکہ ان کے پاس اپنے دفاع کے لئے ملک کی تمام جیسٹ انٹرنی جزل اور ڈپٹی جرنلز، اینڈوکیٹ جزل اور سرکاری وکلاء کی فوج ظفر مومج موجود تھی۔ کیا صدر صاحب نہیں جانتے تھے کہ پاکستان میں لوگ غربت کے ہاتھوں خود کشیاں کر رہے ہیں اور ایسے غریب ملک کے خزانے سے یہ سلوک قومی جرم ہے جس کا حساب اگلے جہان میں بھی دینا ہوگا اسی لئے میں کہتا ہوں کہ دوستو! اقتدار اندھا بھی ہوتا ہے اور بہرہ بھی۔

ظاہر ہے کہ سارا کھیل ”سب سے پہلے کرسی“ کے جذبے سے کھیلا جا رہا ہے اور اب موجودہ سیاسی صورتحال نے ایک بار پھر صدر صاحب کو اپنے نعرے ”سب سے پہلے پاکستان“ کے حوالے سے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ وفاق کی علامت ”صدر“ کے خلاف تین صوبائی اسمبلیاں قراردادیں منظور کر چکی ہیں جبکہ چوتھی صوبائی اسمبلی ایسی ہی قرارداد پاس کرنے والی ہے۔ اگر صدر صاحب کو اپنے نعرے کا تھوڑا سا خیال بھی ہوتا تو ان کو فوری طور پر مستعفی ہو جانا چاہئے کیونکہ اب وہ وفاق کی علامت نہیں رہے بلکہ صرف بلیک میل کی علامت بن کر رہ گئے ہیں۔ بلیک میل کی علامت یوں کہ انہوں نے اپنی سیاسی ہتھ کے لئے اپنے مشیر اعظم طارق عزیز کے مشورے اور محنت سے جو سیاسی نظام تشکیل دیا تھا اس کی بنیاد مکمل طور پر بلیک میل پر تھی۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے عہدیداران، کارکنوں اور سابق اراکین اسمبلیوں کو نیپ اور جیل کا ”بوا“ دکھا کر مسلم لیگ (ق) میں لایا گیا تھا اور ان میں کچھ ایسے معززین بھی تھے جنہیں تھانے کی حوالات سے نکال کر وزارت پر منتھن کر دیا گیا تھا۔ اسی دور میں میں نے بار بار لکھا تھا کہ خوف، بلیک میل، حکومتی طاقت اور آئی ایس آئی کے ذریعے جن سیاستدانوں کو صدر صاحب اپنی جیسا کھینچ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں یہ موقع ملنے پر سب سے پہلے صدر صاحب کو ”ڈچ“ (Ditch) کریں گے اور اس بلیک میل کا انتقام لیں گے کیونکہ رشتے دہنی و نظریاتی ہم آہنگی اور محبت سے بننے اور پروان چڑھتے ہیں نہ کہ خوف اور بلیک میل سے۔ آپ دیکھ چکے کہ صدر صاحب کے بغل بچے مسلم لیگ (ق) کے بے شمار اراکین اسمبلی نے صوبائی اسمبلیوں کی قراردادوں کے حق میں ووٹ دیئے اور گوشرف گو کے نعرے لگائے کیونکہ بقول شخصے اب وہ احتشام خمیر کی بجائے اپنے خمیر کے مطابق ووٹ دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ نیپ کے سابق چیئر مین جزل امجد جن کی دیانتداری کی بڑی شہرت ہے، دو بار انٹرویو میں کہہ چکے کہ نیپ نے چودھری برادران کے خلاف ٹخوں مواد کی بنیاد پر ریفرنس تیار کئے تھے لیکن صدر مملکت نے اجازت نہ دی۔ اب صرف وہ صدر صاحب کے احسان کا بدلہ چکا رہے ہیں ورنہ ایک ایجنٹ پر تو صدر صاحب انہیں بھی مسلم لیگ (ق) کی قیادت سے فارغ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اگر صدر صاحب نوشہہ دیوانہ پڑھیں تو ہم کیسے یقین کر لیں کہ وہ سب سے پہلے پاکستان کے نعرے سے مخلص تھے۔

یوم آزادی کے حوالے سے ایوان صدر کا ڈنریک سبق آموز اور چشم کشا واقعہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کارواں لٹ چکا اور خمیوں کی طنائیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ صدر صاحب کا بچھا ہوا لہجہ اور شرکاء کے اترے ہوئے چہرے اور بعض سابق وزراء کے چہروں پر پچھتاوے اور ندامت کے آثار کارواں کے لٹنے کا راز فاش کر رہے تھے جبکہ جزل کیانی انہیں پی پی برتھ ڈے کہنے اور پرانی رفاقت کا حق ادا کرنے کے بعد ڈنر کے موقع پر کا کول جا چکے تھے تاکہ قوم سمجھ لے کہ فوج مواخذے کے عمل میں غیر جانبدار ہے اور فوج کو بہر حال غیر جانبداری رہنا چاہئے لیکن اس غیر جانبداری کے حوالے سے قدرے احتیاط کی ضرورت ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ فوج نے پاکستان پر تقریباً تین برس حکومت کی ہے اس لئے فوج پاکستان کے اقتدار میں پارٹنر یعنی حصے دار بن چکی ہے اور لاشعوری طور پر پاکستان کو اپنی سلطنت اور جاگیر سمجھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ سلطانی نہ بھی رہے تو بڑے سلطانی نہیں جاتی، حکومت چلی بھی جائے تو اس کی خواہش ذہنوں سے نہیں جاتی۔ فوج کے ذہن سے اس بڑے سلطانی کو نکالنے کی لئے اور صحیح معنوں میں جمہوری قوتوں کی بالادستی تسلیم کروانے کے لئے کم از کم نصف صدی کے جمہوری عمل کی ضرورت ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات ذہنوں میں رہے کہ اگرچہ فوج مواخذے کے عمل میں غیر جانبدار ہے لیکن اسے بہر حال اپنے سابق آرمی چیف کی تذلیل گوارہ نہیں ہوگی۔ ہماری تاریخ میں سیاسی حکمران کبھی بھی فوجی آمر کے مواخذے کے اتنے قریب نہیں تھے جتنے آج ہیں اس لئے ہر کوئی چاہتا ہے کہ عبرت کی مثال قائم کی جائے لیکن جوش میں ہوش کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بی وی پی پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے اور جزل نیازی کے سر پر جوتوں کی بارش کی فلم

دکھائی گئی تھی تو فوج نے اس کا برا منایا تھا۔ ایک مصنف کے بقول فوج کو اس تذلیل کا حساب چکانے کے لئے سات سال انتظار کرنا پڑا۔ اسی طرح جب میاں نواز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت سے استعفیٰ لے کر اسے دودھ سے کبھی کی مانند نکال دیا تھا تو اس سے بھی فوج کو جھکا لگا تھا اور 12 اکتوبر 1999ء کے ایکشن کے پس منظر میں جنرل (ر) جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کا فیصلہ بھی اپنا کردار سرانجام دے رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جن جرنیلوں نے وزیراعظم نواز شریف سے بدتمیزی کی انہیں جہانگیر کرامت سے سلوک پر فوج تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فی الحال ہماری فوجی قیادت بوئے سلطانی میں مبتلا ہے اور وہ ہرگز سابق آرمی چیف کی تذلیل گوارہ نہیں کرے گی۔ اس لئے پہلے قدم کے طور پر صرف آئین کے مطابق صدر صاحب کے مواخذے کے عمل کو مکمل کیا جائے اور انہیں ان کے کارناموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے فوج میں ردعمل پیدا نہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ دراصل حکمرانوں نے صدر صاحب پر دباؤ ڈالنے کے لئے صوبائی اسمبلیوں کا راستہ چنا ہے ورنہ اگر آئین کے مطابق پارلیمنٹ کے ذریعے براہ راست مواخذہ کیا جاتا اور کم سے کم وقت میں سارے عمل کو مکمل کر لیا جاتا تو وہ شاید زیادہ مناسب ہوتا کیونکہ اس مسئلے کو طویل دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ اللہ کرے حکمرانوں کے دباؤ کی حکمت عملی کامیاب ہو اور صدر صاحب خود ہی باعزت طریقے سے استعفیٰ دیدیں تو یہ اس بحران کا سب سے بہترین حل ہوگا اور یہی سب سے بہتر راستہ ہے۔ صدر صاحب ہمیشہ عوام کو سیلوٹ کرتے رہے ہیں اگر ایک بار پھر وہ اسی طرح سیلوٹ کر کے رخصت ہو جائیں تو وہ سب پہلے پاکستان کا نعرہ لگانے میں حق بجانب ہوں گے، ورنہ ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ نعرہ ”سب سے پہلے کری“ تھا۔



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

Uss Rooz Alama Iqbal...

August 14th, 2008

اس روز علامہ اقبال بہت خوش تھے

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

سیدنذیر نیازی مرحوم بتایا کرتے تھے کہ اس روز علامہ اقبال بہت خوش تھے۔ آپ شاید نہ جانتے ہوں کہ سیدنذیر نیازی علامہ اقبال کے پسندیدہ اور محترم استاد مولوی میر حسن کے پیچھے تھے اور مولوی میر حسن، جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا علامہ اقبال کے استاد تھے جن کے بارے میں علامہ نے کہا تھا کہ وہ ”سُر“ کا خطاب تب قبول کریں گے جب برطانوی حکومت ان کے استاد مولوی میر حسن کو بھی خطاب سے نوازے، جب حکومت نے اعتراض کیا کہ مولوی صاحب کی کوئی کتاب اور تصنیف نہیں ہے تو علامہ نے برجستہ جواب دیا تھا کہ ”میں ان کی تصنیف ہوں“۔ چنانچہ حکومت کو مولوی میر حسن کی خدمت میں ٹکس العلماء کا خطاب پیش کرنا پڑا۔ سیدنذیر نیازی کو علامہ اقبال کا قرب حاصل تھا اور علامہ کے آخری چند برسوں میں نیازی صاحب تقریباً ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور رات گئے تک علامہ کے علم و فضل سے استفادہ کرتے تھے۔

میری نوجوانی کے دور میں سیدنذیر نیازی سے مسلسل ملاقاتیں رہیں جن میں وہ علامہ اقبال کی حاضرجوابی، بذلہ نبی، بصیرت اور دور بینی کے واقعات سنایا کرتے تھے، کیونکہ وہ علامہ کی روحانی، علمی اور سیاسی بصیرت کے چشم دید گواہ تھے۔ سیدنذیر نیازی کا کہنا تھا کہ علامہ اقبال محمد علی جناح سے متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ آپ ان کے مغربی لباس اور ظاہر پرندہ جاکیں، جناح اندر سے سچے مسلمان اور راسخ العقیدہ انسان ہیں، چنانچہ جس روز قائد اعظم محمد علی جناح نے بندے ماترم جیسے مسلمان دشمن ترانے پر تبصرہ کرتے ہوئے ”مشرکانہ“ (Idolatrious) قرار دیا اور ان کی تقریر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس روز علامہ اقبال بہت خوش ہوئے کیونکہ ایسی بات وہی شخص کر سکتا تھا جس کا باطن عقیدے سے منور ہو۔ سیدنذیر نیازی نے علامہ اقبال سے لاتعداد ملاقاتوں کو ڈائری کی شکل میں اپنی کتاب ”اقبال کے حضور“ میں پیش کیا ہے جسے اقبال اکادمی نے چھاپا ہے۔ نیازی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 135 پر 2 فروری 1938ء بروز چہارشنبہ کی حاضری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ”یوں دیکھنے میں حضرت علامہ بہت ہشاش بشاش نظر آتے تھے (ان دنوں علامہ بہت علیل تھے اور 1938 میں ہی ان کا انتقال ہو گیا) جب علامہ نے حسب معمول سوال کیا کہ ملک کے حالات کیا ہیں تو راجہ صاحب نے دہلی کے مسلم لیگ اجتماع کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے کہ جناح کی زبان سے دین کا لفظ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ رحماروز نامہ انقلاب لے آیا اور میں نے علامہ کے ارشاد پر بڑے بڑے عنوانات پڑھ کر سنا شروع کر دیے۔ ارشاد ہوا قائد اعظم کی پوری تقریر پڑھ کر سناؤ۔ میں نے تقریر ختم کی تو حضرت علامہ نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ ارشاد ہوا دو باتوں سے جی بہت خوش ہوا ہے۔ ایک تو جناح کے اس کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرک کی بو آتی ہے۔ دوسرے اس پر کہ ہندی ہندوستانی کی تحریک (جو نہرو نے شروع کر رکھی تھی) دراصل اردو پر حملہ ہے اور اردو کے پردے میں بالواسطہ ”اسلامی تہذیب“ پر حملہ ہے۔“

نوجوان نسل کو یاد دلانے کے لئے بندے ماترم کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے تاکہ انہیں علامہ اقبال کی مسرت کا راز سمجھ میں آسکے۔ 1877ء میں آریا سماج تحریک شروع کی گئی تھی جس کا ایک مقصد مسلمانوں اور ہندوستانی عیسائیوں کو ہندو مذہب میں واپس لانا تھا۔ 1882ء میں جی۔ پی۔ اینا مشہور ناول اندامہ شائع کیا جس کا ایک ایک لفظ مسلمانوں کی نفرت سے لبریز تھا۔ اس ناول میں کالی دیوی کے بچوں کا ذکر تھا جو تلوار و تھپہ میں لئے مسلمانوں کے ہر نقش کو مٹانے کے درپے تھے۔ ناول کے یہ بچے مسلمانوں کے گاؤں جلاتے، لوٹتے اور تباہ کرتے تھے۔ ناول کا قصہ یہ تھا کہ انگریز ہندوؤں کو مسلمانوں کی غلامی سے نجات دلانے آئے ہیں اس لئے ان سے تعاون ضروری ہے۔ بندے ماترم اس ناول کا ترانہ تھا جو ہندوؤں کی مسلمانوں کے لئے نفرت کی غمازی کرتا تھا اور بت پرستی پر مبنی تھا۔

1937ء میں جب کانگریس آٹھ صوبوں میں انتخابات جیت کر حکومتیں بنانے میں کامیاب ہوئی تو اول تو کانگریس نے ان صوبوں میں مسلمانوں کا ناظرہ بند کر دیا انہیں اقتدار میں شریک کرنے سے انکار کر دیا اور ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے۔ دوسری طرف سکولوں میں بندے ماترم کا ترانہ، کانگریس کے جھنڈے کو سلامی اور مہاتما گاندھی کے بت کی پرستش لازمی قرار دے دی جو مسلمان بچوں کو کسی قیمت پر بھی گوارہ نہ تھی۔ کانگریس کی ان پالیسیوں کے خلاف شدید رد عمل ہوا جس نے مسلمانوں میں یہ احساس بیدار کرنے میں اہم کردار سرانجام دیا کہ اگر کانگریس انگریزوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو یوں کھلم کھلا نشانہ بن رہی ہے اور انہیں مذہبی، تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی طور پر تباہ کرنے پر تکی ہوئی ہے تو پھر انگریزوں کی رخصتی کے بعد کیا کیا گل کھلائے گی۔ کانگریس کے ڈھائی سالہ دور حکومت میں جو زیادتیاں، بے انصافیاں اور مظالم مسلمانوں سے روا رکھے گئے ان کا پور پور رپورٹ میں تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

1938-39ء میں جناح نہرو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ نومبر 1939ء میں قائد اعظم نے کانگریس کے ساتھ سمجھوتے کے لئے جو پانچ شرائط پیش کیں ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسلمان بچوں کو بندے ماترم کا ترانہ پڑھنے کے جبر سے آزاد کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ کانگریس نے حسب معمول قائد اعظم کی شرائط کو مسترد کر دیا، چنانچہ جب دسمبر 1939ء میں کانگریس وزارتوں کا خاتمہ ہوا تو مسلم لیگ نے سارے ملک میں جوش و خروش سے یوم نجات منایا۔ تحریک آزادی کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ آٹھ صوبوں میں ڈھائی سالہ کانگریسی دور حکومت 1937-1939ء میں مسلمانوں میں ایک علیحدہ اور آزاد وطن کے مطالبے کا شعور پیدا کرنے میں سب سے اہم کردار سرانجام دیا اور ان میں یہ احساس بیدار کیا کہ ان کے قومی، تہذیبی، اقتصادی اور مذہبی وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک آزاد ملک کا حصول ناگزیر ہے۔ 1939ء میں ہی قائد اعظم نے وائسرائے کو ملاقاتوں میں یہ واضح کر دیا تھا کہ کانگریس روئے کو دیکھ کر وہ مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے قائل ہو چکے ہیں۔ اس پس منظر میں مسلم لیگ نے 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی اور پھر حصول پاکستان کو اپنی حتمی منزل قرار دے دیا۔ قیام پاکستان اللہ تعالیٰ کا انعام عظیم تھا جو 14-15 اگست 1947ء کی درمیانی شب ماہ رمضان کی ستائیسویں یعنی ”شب قدر“ کو وجود میں آیا۔ افسوس کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کی وہ قدر نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔ علاقائی اور نسلی منافرتوں کی راہ پر تحریک پاکستان کا جذبہ پروان چڑھا تھا جو ہماری قومی یکجہتی کی ضمانت تھا۔ بدقسمتی سے آج پاکستان پھر سے علاقائی اور نسلی تعصبات کی آماجگاہ بن چکا ہے اور ہماری قیادت کے دیوالیہ پن نے ملکی استحکام کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس وقت ہمیں پھر سے ایک ایسے قائد اعظم کی ضرورت ہے جو پاکستان کو صحیح معنوں میں پاکستان بنائے اور پاکستان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns, Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

Page 4 of 31 [«12345678»](#)...[Last »](#)